رموزِ بیخودی — اجتماعی خودی کی تشکیل

ڈاکٹر عبدالمغنی

اسرارِ خودی میں فرد کی خودی کے بیانات کے ساتھ ساتھ جماعت کی خودی کے اشارات بھی پائے جاتے ہیں سب سے بڑھ کر انفرادی خودی کے بیان میں جو گہرائی اور توازن نیز سنجیدگی اور بلندی ہے اس سے اجتماعی خودی کا ایک بلیغ اشارہ ملتا ہے۔ اس سلسلے میں بنیادی نکتہ یہ ہے کہ اقبال کا نظریہ خودی ان کے تصورِ خدا پر مبنی ہے، یہ عقیدۂ توحید ہی ہے جو انسان کی حریت و اخوت دونوں کا ضامن ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا نے جس طرح افراد کی تخلیق و تعلیم کی ہے اسی طرح ملت کی تشکیل و تربیت بھی اور اس وسیع پیمانے پر تعمیرِ حیات کے لیے خدا نے جس اُصول کو پسند کیا ہے وہ اسلام ہے یعنی خدا کی بندگی کا قانونِ فطرت جو پوری کائنات میں جاری و ساری ہے۔ اس آفاقی نقطۂ نظر سے فرد جماعت کی خودی و بے خودی باہم دگر پیوستہ ہیں اور دنیا میں زندگی کا سارا نغمہ ان کی ہم آہنگی سے پھوٹا ہے۔ لہٰذا اسرارِ خودی کے صرف تین سال بعد ۱۹۱۸ء میں اقبال نے رموزِ بیخودی تصنیف کی۔ دوسری کتاب پہلی کتاب کا تتمہ یا تکملہ ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ ایک ہی کتاب کے دو حصے ہیں۔ اس معاملے میں اقبال کے عقیدۂ توحید کے ساتھ ہی ان کا عشق رسولؐ بھی ایک فیصلہ کن امر ہے۔ ان کے مومن قلب و دماغ کی ترکیب توحید و رسالت کے مشترک تصورات سے ہوئی ہے۔ ایمان باللہ اور ایمان بالرسول دونوں نظریہ خودی کے عناصر ترکیبی ہیں۔ چنانچہ انسان کی خودی کے اثبات و اظہار کا وسیلہ ملت اسلامیہ ہے، جو خدا کے آخری پیغام کی حامل اور ختم الرسل کی شریعت کی علم بردار ہے۔ نہ صرف ملت کے ذریعے بلکہ ملت کے لیے بھی خودی کارفرما ہوتی اور اپنا جوہر دکھاتی ہے۔ اقبال کے فلسفیانہ افکار کا مقصد ہی ملت کی شیرازہ بندی اور ترقی ہے، جسے وہ عام انسانیت کی وحدت و نہضت کا پیش خیمہ سمجھتے ہیں۔ فرد جس طرح اپنی شخصیت کے فروغ کے لیے اسرارِ خودی کا عرفان حاصل کرسکتا ہے اسی طرح ملت کے ارتقا کے لیے اسے رموزِ بیخودی کا شعور حاصل کرنا چاہیے۔ فرد کی خودی کائنات کے مقابلے میں ہے، جب کہ اس کی بے خودی ملت کے مقابلے میں ہے، وہ کائنات

کی تسخیر کرتا ہے اور ملت کی خدمت۔

رموزِ بیخودی کا دیباچہ ''پیش کش بحضور ملتِ اسلامیہ'' ہے۔ اس میں ملت کو اپنی حقیقت سے بیگانہ وشی پر تنبیہ کی گئی ہے اور قائدِ ملتؐ کے ساتھ وفائے عہد کی تلقین:

اے نظر بر حسنِ ترسا زادۂ — اے ز راہِ کعبہ دور افتادۂ
طرحِ عشق انداز اندر جانِ خویش — تازہ کن با مصطفیٰ پیمانِ خویش

اے ملت اسلامیہ! تیری نگاہیں مسیحیت کے چہرے پر بھٹک رہی ہیں اور تو راہِ کعبہ سے دور جا پڑی ہے، اپنی روح کے اندر جذبۂ عشق پیدا کر اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے کیے ہوئے پیمانِ وفا کی تجدید کر۔''

اس کے بعد شاعر خود اپنے عشق کا ذکر کرتا ہے، جو خدا اور رسول اور ملت اسلامیہ تینوں کے لیے ہے۔ وہ اپنی ملت کے دل میں اپنے اسی عشق کی آگ ڈال دینا چاہتا ہے یعنی اپنے آپ کو اس کی خدمت کے لیے وقف کرتا ہے:

من ہمیں یک گل بہ دستارت زنم — محشرے بر خوابِ سرشارت زنم
تاز خاکت لالہ زار آید پدید — از دمت باد بہار آید پدید

میں اپنے اسی عشق کے شعلے کا پھول تیری دستار میں لگاتا ہوں، تاکہ تو اپنے خواب شیریں سے بیدار ہو اور تیری خاک سے دنیا میں ایک لالہ زار اُگے، جس میں تیرے دم سے بادِ نو بہار چلے۔

کتاب کی ''تمہید'' میں ''ربطِ فرد و ملت'' کا معنی بیان کیا گیا ہے۔ اس میں ربطِ جماعت کو فرد کے لیے ایک رحمت قرار دیتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ فرد کی خودی کا جوہر ملت ہی کے ساتھ مربوط ہو کر اپنے کمال کو پہنچتا ہے، پھر فرد و ملت کی باہمی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس سلسلے میں خوبصورت شاعرانہ تصویروں کے علاوہ فکر انگیز فلسفیانہ نکتے پیش کیے گئے ہیں۔ آخر میں خودی و خدا کے رشتے واضح کر کے ملت کی خودی کا ایک آفاقی و عملی تناظر قائم کیا گیا ہے:

فرد را ربطِ جماعت رحمت است — جوہر او را کمال از ملت است
فرد و قوم آئینہ یک دیگر اند — سلک و گوہر، کہکشاں و اختر اند
فرد می گیرد ز ملت احترام — ملت از افراد می یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود — قطرۂ وسعت طلب قلزم شود
وصلِ استقبال و ماضی ذاتِ او — چوں ابد لا انتہا اوقاتِ او
فرد تنہا از مقاصد غافل است — قوتش آشفتگی را مائل است
قوم باضبط آشنا گرداندش — نرم رو مثل صبا گرداندش

در جماعت خود شکن گردد خودی تا ز گل برگِ چمن گردد خودی

فرد وقوم ایک دوسرے کا آئینہ ہیں، ان کا رشتہ سلک و گوہر اور کہکشاں واختر کا ہے، فرد کی عزت ملت کے تعلق سے ہے اور ملت کا نظام افراد پر قائم ہے، فرد جب جماعت سے پیوستہ ہوتا ہے تو گویا قطرہ پھیل کر سمندر بن جاتا ہے، حال کے ساتھ ہی ماضی و مستقبل بھی فرد کی شخصیت کے حصے ہیں اور اسی جامعیت کے باعث اس کے اوقات لامتناہی ہیں، فرد تنہا ہو کر مقاصد سے غافل ہوسکتا ہے اور پراگندگی کی طرف مائل، مگر قوم اسے ضبط و نظم سے آشنا کرتی اور نتیجتاً اس کے اندر نسیم وصبا جیسی لطافت پیدا کرتی ہے، خودی جماعت کے اندر رہ کر خود شکن ہوتی ہے اور ایک برگِ گل سے پورا گلستان پیدا کرتی ہے۔

ملت ونبوت

فرد وملت کے ربط باہمی کی اہمیت واضح ہے، فرد کی نمود جماعت کی سطح پر ہی ہوتی ہے، وہ کسی ملت کے باغ کا ہی ایک پھول ہوتا ہے، گرچہ اس کے مزاج میں یکتائی کا جوش ہے مگر اس کا تحفظ انجمن آرائی سے ہوتا ہے، ستاروں کی محفل باہمی کشش سے ہی قائم ہے:

در جماعت فرد را بینیم ما از چمن او را چوگل چینیم ما
فطرتش وارفتہ یکتائی است حفظِ او از انجمن آرائی است
محفلِ انجم زجذبِ باہم است ہستی کوکب ز کوکب محکم است

لیکن کبھی ملت بھی بے جان ہوجاتی ہے، اس کے اندر تن آسانی، بزدلی اور بے سمتی پیدا ہوجاتی ہے، وہ عزم وآرزو سے محروم نظر آتی ہے، محنت سے جی چراتی ہے، اوہام میں مبتلا ہوتی ہے، اس کی خودی مجروح بلکہ غائب ہوجاتی ہے۔ ایسی حالت میں خدا پیغمبر کو بھیجتا ہے جو ملت کو ایک کتاب دیتا اور حیاتِ تازہ بخشتا ہے، اسے ایک نیا زاویہ نظر عطا کرتا ہے اور ہستی کے ایک نئے گلستاں کی طرح ڈالتا ہے:

سست و بے جاں تار و پودِ کاراو ناکشودہ غنچہ پندارِ او
گوشالِ جستجو ناخوردۂ زخمہ ہائے آرزو ناخوردۂ
بیم جاں سرمایہ آب و گلش ہم ز باد تند می لرزد دلش
منزل دیو وپری اندیشہ اش از گمانِ خود رمیدن پیشہ اش
جانِ او از سخت کوشی رم زند پنجہ در دامانِ فطرت کم زند
تا خدا صاحب دلے پیدا کند کو ز حرفے دفترے املا کند
ساز پروازے کہ از آوازۂ خاک را بخشد حیات تازۂ

تازہ اندازِ نظر پیدا کند گلستان در دشت و در پیدا کند

اللہ کا رسول انسان کو غیر اللہ کی پرستش سے آزادی دلاتا ہے، تاکہ انسان اپنے ہی جیسے انسانوں کی غلامی سے نجات پائے اور اپنی ذات کی اہمیت کا شعور حاصل کرے، پھر ایک نصب العین پر اپنی توجہ مرکوز کر کے ایک آئین کی پابندی کرے۔ اس پابندیِ قانون سے انسان کے اندر غرور و نخوت کے بجائے حلم و تحمل کا مادہ پیدا ہوگا اور وہ نکتہ توحید کے فوائد سے فیض یاب ہو سکے گا:

بندہا از پاکشاید بندہ را از خداوندان رباید بندہ را
گویدش تو بندۂ دیگرنہ زین بتانِ بے زباں کمتر نہ
تاسوے یک مدعایش فی کشد حلقۂ آئیں بہ پایش می کشد
نکتہ توحید باز اموزدش رسم و آئینِ نیاز آموزدش

ملتِ اسلامی کے اساسی ارکان

اوّل: توحید

امت کی بنیادی وحدتِ الٰہ کے عقیدے پر قائم ہے، یہی وہ محور ہے جس کے گرد سیّارے اُصولِ اجتماعیت مجتمع ہیں، تصورِ توحید مرکزِ ملت ہے، اس سے ایک آفاقی ترکیب اور عالمی تنظیم پیدا ہوتی ہے، ایک بین الاقوامی برادری بنتی ہے، جو یک سوئی کے ساتھ مشترک مقاصد کے لیے کام کرتی ہے، ایک نصب العین کی خدمت کرتی ہے، ایک مطمحِ نظر کے مطابق حرکت میں آتی ہے، اس کی سرگرمیوں کی ایک جہت ہوتی ہے، اس کا سفر ایک منزل کی طرف ہوتا ہے، دلوں میں یقین ایک خدا پر ایمان سے محکم ہوتا ہے، اسی یقین سے یک رنگی و ہم آہنگی اور اخوت و مساوات پیدا ہوتی ہے، حق و باطل کے درمیان امتیاز کا ایک معیار نصیب ہوتا ہے، ایمان بالغیب رنگ و خوں، نسل و وطن، زبان و تہذیب اور دولت و مرتبت کے بے جا امتیازات ختم کر کے ایک متحد و متفق ملت کا قیام عمل میں لاتا اور اسے مضبوط بنیادوں پر مستحکم کرتا ہے، ملت کے اندر حکمت و بصیرت اور سعی و عمل کے سارے سوتے توحید ہی سے پھوٹتے ہیں، ایمان باللہ سے ہی نظام و آئین اور قوت و تمکین سب کچھ میّسر آتے ہیں:

دیں ازاو حکمت ازو، آئیں ازو زور ازو، قوت ازو، تمکیں ازو
پست اندر سایہ اش گردد بلند خاک چوں اکسیر گردد ارجمند
بیم و شک میرد، عمل گیرد حیات چشم می بیند ضمیرِ کائنات
ملتِ بیضا تن و جاں لا الٰہ سازِ مارا پردہ گراں لا الٰہ

حرفش از لب چوں بدل آید ہمی — زندگی را قوت افزاید ہمی
ملت از یک رنگیِ دل ہاستے — روشن از یک جلوہ این سینا ستے
قوم را اندیشہ ہا باید یکے — در ضمیرش مدعا باید یکے
جذبہ باید در سرشتِ او یکے — ہم عیارِ خوب و زشتِ او یکے
گرنہ باشد سوزِ حق در سازِ فکر — نیست ممکن ایں چنیں اندازِ فکر
اصلِ ملت در وطن دیدن کہ چہ؟ — بادو آب و گل پرستیدن کہ چہ؟
برنسب نازاں شدن نادانی است — حکمِ او اندر تن و تن فانی است
ملتِ مارا اساسِ دیگر است — ایں اساس اندر دلِ ما مضمراست
حاضریم و دل بہ غائب بستہ ایم — پس زبندِ این وآں وارستہ ایم
مدعائے ما، مآلِ ما یکے ست — طرز و اندازِ خیال ما یکے ست
ماز نعمت ہائے او اخواں شدیم
یک زبان ویک دل ویک جان شدیم

نا اُمیدی اور ڈر انسان کے سب سے بڑے دشمن ہیں، جس شخص کا دل خوف خدا سے خالی ہوتا ہے وہ بزدل ہو جاتا ہے، جب کہ خدا ترس انسان کے دل میں کبھی کسی قسم کے خوف کا گزر نہیں ہوتا اور اس کی ہمت ہمیشہ بلند رہتی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس ہو کر زندگی میں کوئی اُمید باقی نہیں رہ جاتی، جب کہ خدا کی رحمت کا امیدوار ہمیشہ پراُمید رہتا ہے اور اس کا قلب آرزوؤں سے سرشار ہوتا ہے، توحید انسان کو غم والم سے نجات دے کر اس کے اندر رجائیت اور نشاطِ کار پیدا کرتی ہے، غیر اللہ کا خوف ہر برائی کی جڑ ہے اور اس سے ہر قسم کی رذیل خصلتیں کردار میں سرایت کر جاتی ہیں، دنیا کا خوف شرک ہے، جس کا ازالہ صرف توحید سے ہوسکتا ہے:

مرگ را ساماں ز قطعِ آرزو ست — زندگانی محکم از لا تقنطواست
اے کہ درد زندانِ غم باشی اسیر — از نبیؐ تعلیم لاتحزن بگیر
قوتِ ایماں حیات افزایدت — وردِ لا خوف علیہم بایدت
بیمِ غیر اللہ عمل را دشمن است — کاروانِ زندگی را رہزن است
ہر شرِ پنہاں کہ اندر قلبِ تست — اصل او ہم است اگر بینی درست
لابہ و مکاری وکین ودروغ — ایں ہمہ از خوف می گیرد فروغ
ہرکہ رمزِ مصطفیٰ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

ایک بار تیر و شمشیر کے درمیان مکالمہ ہوا تو تیر نے شمشیر کی بہت تعریف کرنے کے بعد بتایا کہ تیر کی اپنی خصوصیت یہ ہے کہ جب وہ کمان سے چھوٹتا ہے تو صرف اس قلب کو چھید ڈالتا ہے جو سلیم نہیں ہوتا، لیکن مومن کے قلب سلیم سے ٹکرا کر تیر ایک قطرہ شبنم کی طرح ٹپک پڑتا ہے۔

اکبر کی کوشش الحاد کے بعد ہندوستان میں تخت شاہی سے توحید اور شرع اسلامی کا علم بلند کرنے والے اورنگ زیب عالم گیرؒ کی خدا پرست سیرت کا ایک واقعہ نہایت سبق آموز ہے۔ ایک بار وہ بندۂ خدا صبح کی سیر کے دوران محوِ نماز تھا کہ ایک شیر ببر نے اس پر حملہ کر دیا، بادشاہ ذرا بھی نہیں گھبرایا اور میان سے تلوار نکال کر اس نے شیر کا کام تمام کر دیا، پھر عبادت میں مشغول ہو گیا۔ یہ صرف اورنگ زیبؒ کا خوفِ خدا تھا جس نے شیر تک کے خوف سے اس کے قلب کو محفوظ کر دیا تھا، اس کی بے پناہ شجاعت کا راز اس کا ایمانِ محکم تھا، خدا کی محبت اور اس کے ڈر نے ہی بادشاہ کو مہیب سے مہیب خطرات کی طرف سے بے فکر اور ان کے مقابلے میں دلیر بنا دیا تھا، صحیح معنے میں اس کا دل شرک سے بالکل خالی اور توحید سے پُر تھا، اسی لیے اس کی خودی بلند تھی اور اس کا کردار خدا شناسی اور خود آگہی کی بنا پر استوار تھا:

خویش را در بازو خود را باز گیر — دام گستر از نیاز و ناز گیر
عشق را آتش زنِ اندیشہ کن — روبہ حق باش و شیری پیشہ کن
خوفِ حق عنوانِ ایمان است و بس
خوفِ غیر از شرکِ پنہاں است و بس

دوم: رسالت

رسالت توحید کا جزوِ لازم ہے۔ خدا کی وحی رسول پر نازل ہوئی اور ان کے ہی ذریعے ملت کو خدا کا پیغام اور نظام ملا۔ اس طرح رسالت کا تصور جسم ملت میں روح کی طرح جاگزیں ہے۔ اسی تصور سے دین بھی ہے، آئین بھی۔ فردِ خدا کی مخلوق ہے۔ مگر ملتِ رسول سے منسوب ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے کعبہ کی تعمیر کے وقت ملتِ اسلامیہ اور ختم الرسلؐ کے ظہور کی تمنا و دعا کی تھی، جو قبول ہوئی، رسول اللہ ﷺ سے اہلِ ایمان کو ملی وحدت، باہمی اخوت اور اللہ کتاب ملی، جس کی حکمت و نصیحت ملت کی رگِ گردن ہے:

حق تعالیٰ پیکرِ ما آفرید — وز رسالت در تنِ ماجاں دمید
از رسالت در جہاں تکوینِ ما — از رسالت دینِ ما آئینِ ما
از رسالت صد ہزارِ ما یک است — جزوِ ما از جزوِ مالاینفک است
ما ز حکم نسبتِ او ملتیم — اہلِ عالم را پیامِ رحمتیم

قلبِ مومن راکتابش قوت است حکمتش حبل الوریدِ ملت است
فرد از حق ملت ازوے زندہ است از شعاعِ مہرِ او تابندہ است

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ رحمۃ للعالمین تھے، جس طرح اللہ تعالیٰ ربّ العالمین ہے۔ رسول اللہؐ کے ماننے والے بھی اسی نسبت سے پوری دنیا کے لیے رحمت ہیں۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم خدا کے آخری رسول ہیں اور اُمتِ مسلمہ آخری قوم ہے جو خدا کے آخری پیغام کی حامل ہے۔ رسالت کی ساری صفات کی تکمیل محمد الرسولؐ کی سیرت میں ہوگئی ہے۔ اور آپؐ کی شریعت دین کا اوجِ کمال ہے۔ اس شریعت پر ایمان رکھنے والی اور اس سیرت کو نمونۂ عمل تصور کرنے والی امت ملی اُصول وعمل کی جامع اور مکمل ترین قوم ہے۔ یہی راز ہے تمام کثرت وتنوع کے باوجود ملتِ اسلامیہ کی اندرونی وحدت و تنظیم کا۔ اسلام پوری انسانیت کے لیے مکمل ضابطۂ حیات ہے اور امتِ مسلمہ اسلامی نصب العین کے تحت آفاقی و عالمی طور پر دنیا کے تمام انسانوں کی صلاح وفلاح کی ذمے دار وعلم بردار ہے:

از رسالت ہم نواگشتیم ما ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما
کثرتِ ہم مدعا وحدت شود پختہ چوں وحدت شود ملت شود
زندہ ہر کثرت زبندِ وحدت است وحدتِ مسلم، زدینِ فطرت است
پس خدا برما شریعت ختم کرد بر رسولِ ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفلِ ایام را اُد رسل را ختم و ما اقوام را

رسالتِ محمدی نے عالمِ انسانیت کو عام حریت، مساوات اور اخوت کا سبق دیا، قیصر وکسریٰ، سلطان و امیر اور اسقف و براہمن سب کے طوق غلامی سے انسان کو نجات دلائی، اصحابِ دولت واقتدار نے عوام کے جو حقوق غصب کر لیے تھے انھیں واپس دلائے، پرائی زندگی کی ساری لعنتیں ختم کر دیں اور ایک نئی زندگی دنیا کو بخشی، جس سے روئے زمین پر خیر و برکت اور ہر قسم کی مادّی و روحانی ترقیات کا ایک نیا دور شروع ہوا، ایک خدا کی بندگی اختیار کر کے انسان تسخیرِ کائنات کی تازہ مہم پر آگے بڑھا، معاشرے کی تنظیمِ جدید ہوئی، جس سے انسان اور انسان کے درمیان سارے مصنوعی امتیازات اور غیر فطری تفرقے ختم ہو گئے، شرافت وعزت کا واحد معیار صرف صالح کردار قرار پایا:

از غلامی فطرتِ او دوں شدہ نغمہ ہا اندر نے او خوں شدہ
تا امینے حق بہ حق داراں سپرد بندگاں را مسندِ خاقاں سپرد
قوت او ہر کہن پیکر شکست نوعِ انسان را حصارِ تازہ بست
عصرِ نو کایں صد چراغ آوردہ است چشم در آغوشِ او واکردہ است

نقشِ نو بر صفحہ ہستی کشید امتے گیتی کشائے آفرید
مرسلاں و انبیاء آبائے او اکرمِ اونزدِ حق اتقائے او
کل مومن اخوۃ اندر دلش حریت سرمایہ آب و گلش
ناشکیب امتیازات آمدہ
در نہادِ او مساوات آمدہ

ملی اخوت و مساوات وحریت کی تمثیل کے لیے اسلامی تاریخ کے تین عبرت انگیز واقعات پیش کیے گئے ہیں۔ایک جنگِ ایران میں شکست خوردہ لشکر کے سالار جابان کی معافی کا قصہ ہے جسے صرف اس لیے چھوڑ دیا گیا کہ ایک مسلمان نے اسے امان دے دی تھی اور اسے پوری ملت کی طرف سے امان تسلیم کر لیا گیا:

ہر یکے از ما امینِ ملت است صلح و کینش صلح و کینِ ملت است
ملت ار گردد اساسِ جانِ فرد عہدِ ملت می شود پیمانِ فرد

ایک فرد کی صلح پوری ملت کی صلح ہے اور ایک شخص کا عہد پوری جماعت کا عہد ہے۔

دوسرا قصہ سلطان مراد اور معمار کا ہے۔سلطان نے ایک مسجد بنوائی مگر اس کی تعمیر اسے پسند نہ آئی تو اس نے معمار کا ہاتھ کاٹ لیا۔معمار نے قاضی کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔سلطان مدعا علیہ بن کر حاضر ہوا اور اس سے حکمِ قرآنی کے مطابق قصاص طلب کیا گیا،لیکن جب اس نے اپنا ہاتھ کاٹنے کے لیے معمار کے سامنے بڑھا دیا تو معمار نے عدل پا کر احسان کیا،جس کا فرمان بھی قرآن نے دیا ہے،اور سلطان کو معاف کر دیا:

پیشِ قرآں بندہ و مولا یکے است
بوریا و مسندِ دیبا یکے است

قرآن کی نگاہ میں غلام و آقا ایک دوسرے کے برابر ہیں اور جو اہمیت ریشمی مسند کی ہے وہی چٹائی کی ہے۔

تیسرا واقعہ کربلا کا دردناک حادثہ ہے،جس میں رسول اللہ ﷺ کے نواسے حضرت امام حسینؓ نے اسلامی اُصولِ خلافت کے تحفظ کے لیے بے مثال قربانی دی،نظامِ حکومت میں استبداد کی بدعت پر کاری ضرب لگائی اور توحید کی بخشی ہوئی آزادی کا علم بلند کیا،یہ عقل کی مصلحت کوشی کے برخلاف عشق کی سرفروشی کا کارنامہ تھا،جس سے ایمان و یقین اور خدا کی کبریائی کا ڈنکا قیامت تک بجتا رہے گا اور انسانیت کو راہِ حق میں جرات وبصیرت کا پیغام بھی ملتا رہے گا:

عقل را سرمایہ از بیم و شک است عشق را عزم و یقین لاینفک است
عشق را آرامِ جاں حریت است ناقہ اش را ساربان حریت است
تاقیامت قطعِ استبداد کرد موجِ خون او چمن ایجاد کرد
بہرِ حق در خاک و خوں غلطیدہ است پس بنائے لا الٰہ گردیدہ است
تارِ ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز تازہ از تکبیرِ او ایماں ہنوز

آفاقی ملت

امتِ مسلمہ مکان کی حد بندیوں سے آزاد ہے، اس کا تعلق کسی خاص سرزمین سے نہیں، یہ آفاق میں پھیلی ہوئی ہے۔ اسی لیے جب حضرت کعبؓ نے قصیدہ بانت سعاد میں رسول اللہؐ کی مدح کرتے ہوئے آنحضورﷺ کو سیف من سیوف اللّٰہ (اللہ کی تلوار) بنادیا، تاکہ آپ کے وجود کی نسبت کسی ایک ملک کی طرف نہ سمجھی جائے:

قلبِ ما از ہندو روم و شام نیست مرزبومِ او بجز اسلام نیست

ہمارا قلب ہندوروم وشام کا نہیں، اس کا وطن تو صرف اسلام ہے۔

اسی لیے رسول اللہﷺ نے ساری زمین کو مسلمانوں کے لیے مسجد قرار دیا اور ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں کو کسی ایک مقام میں مقید ہوکر نہیں رہنا چاہیے:

تاز بخشش ہائے آں سلطانِ دین مسجدِ ماشد ہمہ روے زمیں
صورتِ ماہی بہ بحر آباد شو یعنی از قیدِ مقام آزاد شو

یہی وجہ ہے کہ اسلام وطن پرستی کا مخالف ہے۔ قوم پرستی نے فی الواقع انسان کو انسان سے الگ کر کے قبائلیت پیدا کی ہے، جس سے انسانی اخوت فنا ہوگئی ہے، بنی نوعِ انسان کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا ہے اور روح اس کے اندر سے نکل گئی ہے:

آں چناں قطعِ اخوت کردہ اند بر وطن تعمیرِ ملت کردہ اند
تا وطن را شمعِ محفل ساختند نوعِ انساں را قبائل ساختند
مردمی اندر جہاں افسانہ شد آدمی از آدمی بیگانہ شد
روح از تن رفت و ہفت اندام ماند آدمیت گم شدو اقوام ماند

وطن سے ہجرت رسولِ خداؐ کی سیرت کا ایک نہایت فکر انگیز واقعہ ہے:

ہجرت آئین حیاتِ مسلم است ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم است

ہجرت مسلمان کا آئینِ حیات اور اس کے لیے ثبات و استقلال کا باعث ہے۔

لازوال ملت

ملتِ اسلامیہ وقت کی قید سے آزاد ہے، افراد کو فنا ہے، مگر اس جماعتِ اسلامیہ کو بقا ہے جو توحید و رسالت کی بنیادوں پر اُستوار ہے، یہ امت لازوال ہے، اس کی بے خزاں ہے، زمانے کی دست برد اسے مٹا نہیں سکتی، مکان ہی کی طرح اس کا زمان بھی بے کنار ہے، جب تک ملت کا مقصودِ حیات موجود ہے اس کا دریا خشک نہیں ہوگا، خواہ تعمیر و تخریب کے کتنے ہی چکر چلیں اور اور گردشِ ایام کے کتنے ہی نشیب و فراز سامنے آئیں، قوموں کی بھی ایک اجل قرآن کے لفظوں میں ہے، لیکن امتِ مسلمہ کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے لی ہے، جیسا اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (ہم نے اپنا کلام نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں) اور یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَیَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ کَرِهَ الْکٰفِرُوْنَ (کفار و مشرکین اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھانا چاہتے ہیں، لیکن خواہ کفار کو کتنا ہی ناگوار ہو اللہ تو اپنا نور مکمل کر کے رہے گا) کی آیاتِ قرآنی سے واضح ہے۔ فتنۂ تاتار کا واقعہ بھی ملتِ اسلامیہ کی بقاے دوام کا ایک بین ثبوت ہے۔ اس وقت کے ملی مرکز بغداد، کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی، مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ مگر امتِ مسلمہ اپنی جگہ قائم رہی، یہاں تک کہ بغداد کو تباہ کرنے والوں ہی نے اسلام کا علم اٹھالیا اور متعدد مسلم سلطنتیں ان کی فتوحات سے وجود میں آئیں، جن کے ذریعے صدیوں تک انسانیت کی زبردست ترقیات ہوتی رہیں:

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

ملتِ اسلامی ملتِ ابراہیمی ہے اور خلیل اللہ کی طرح اس نے وقت کے روشن کیے ہوئے کتنے ہی آتش کدوں سے گلزار کھلائے ہیں۔ امتِ مسلمہ ایک نصب العین سے عشق اور خدا اور رسول کی محبت پر مبنی ہے۔ یہ عشق عالم کے اجزاے پریشاں کو ترکیب دے کر وجود عطا کرتا ہے۔ اس سے ہستی کی سالمیت کا قیام و استحکام اور اس کی حامل ملت کا استقلال و استمرار وابستہ ہے۔ توحید کی روح اور رسالت کی برکت ملتِ اسلامیہ کو لازوال بنانے کے لیے کافی ہے، لہٰذا اس کے کمالات تا قیامت ظاہر ہوتے رہیں گے، دنیا کا وجود ہی اس کے دم قدم سے ہے:

فصلِ گل از نسترن باقی تراست از گل و سرو و سمن باقی تراست
ہم چناں از فرد ہائے پے سپر ہست تقویمِ امم پاینده تر
زنده فرد از ارتباطِ جان و تن زنده قوم از حفظِ ناموس کہن

مرگِ فرد از خشکی رودِ حیات　　مرگِ قوم از ترکِ مقصودِ حیات
از اجل این قوم بے پرواستے　　استوار از نحن نزلنا استے
تا خدا ان یطفوا فرمودہ است　　از فسردن ایں چراغ آسودہ است
از تہ آتش براندازیم گل　　نارِ ہر نمرود راسازیم گل
شعلہ ہائے انقلابِ روزگار　　چوں بہ باغِ مارسد گردد بہار
درجہاں بانگِ اذاں بودست و ہست　　ملتِ اسلامیاں بودست و ہست
عشق آئینِ حیاتِ عالم است　　امتزاجِ سالماتِ عالم است
عشق از سوزِ دلِ مازندہ است　　از شرارِ لا الٰہ تابندہ است

گرچہ مثلِ غنچہ دل گیریم ما
گلستاں میرد اگر میریم ما

آئینِ ملت

ملتِ اسلامیہ کی تشکیل ایک آئین پر مبنی ہے، جس کے بغیر وہ نہ زندہ رہ سکتی ہے نہ ترقی کرسکتی ہے:

ہستیِ مسلم زآئین است و بس　　باطنِ دینِ نبی این است و بس

آئین قانونِ فطرت ہے، پتی آئین کے تحت پھول بنتی ہے اور پھول گل دستہ بن جاتا ہے، آواز کے انضباط سے ہی نغمہ پیدا ہوتا ہے، ورنہ محض شوروغوغا ہوگا، سانس پابند نے ہوکر ایک نوائے دلکش بن جاتی ہے۔ اس طرح دنیا کی ہر چیز آئین کی خوبی سے قائم ہے اور نشوونما پا رہی ہے، خوب سے خوب تر ہو رہی ہے۔ انسانیت اور اس کی بہترین جماعت، ملتِ اسلامیہ کا بھی ایک آئین ہے، جو قرآنِ حکیم ہے، یہ مسلمانوں کا دستورِ حیات ہے، ان کا مایہ وقار ہے، اس کی حکمت لازوال ہے، تکوینِ حیات کا باعث ہے اور اس سے ثبات واستقلال حاصل ہوتا ہے:

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست؟　　زیرِ گردوں سرِ تمکینِ تو چیست؟
آں کتابِ زندہ، قرآنِ حکیم　　حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخہ اسرارِ تکوینِ حیات　　بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

کتاب اللہ خدا کا آخری پیغام انسانوں کے نام ہے، یہ مکمل ضابطہِ حیات ہے اور بنی نوعِ انسان کے لیے ایک پیامِ رحمت ہے:

نوعِ انساں را پیامِ آخریں　　حاملِ اور رحمۃ للعالمین

قرآن کے آئینِ زندگی نے لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب برپا کر دیا ہے، بڑے بڑے رہزن بھی اس کے پابند ہوکر دنیا کے رہبر ہوگئے ہیں:

رہزناں از حفظِ اور رہبر شدند از کتابے صاحبِ دفتر شدند

لیکن مسلمانوں نے قرآن سے بیگانہ ہوکر اپنی ملی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور اسی ناپسندیدہ روش کے سبب ان کا عروج وال میں بدل گیا ہے:

قطع کردی امرِ خود را در زبر جادہ پیمائی الی شیء نکر

بہر حال، اسلامی زندگی قرآن پر پورا پورا عمل کیے بغیر ممکن نہیں، اللہ کی کتاب میں درج آئین پر بہ تمام وکمال کاربند ہوکر ہی مسلمان عزت کی زندگی گزار سکتے اور دنیا میں آگے بڑھ سکتے ہیں، ان کا وجود اور عروج دونوں آئینِ قرآنی سے ہی وابستہ ہیں:

گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

تقلید بمقابلہ اجتہاد

اقبال فکری ونظری طور پر اجتہاد کو ملی وجود کی تازگی کے لیے ضرور قرار دیتے رہے، مگر عملاً انھوں نے دیکھا کہ آزادی رائے ایک ایسی آزاد روی اور اغیار کی غلام پیدا کر رہی ہے جس سے ملت میں انتشار برپا ہے اور مسلمانوں کا کردار پست ہو رہا ہے، ناپختہ خیالات فقط زمانہ سازی اور مفاد پرستی کے لیے ظاہر کیے جاتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ملت کی مرکزیت ختم ہوچکی ہے اور وہ چلتی ہوئی ہواؤں کے رخ پر ناچ رہی ہے۔ لہٰذا ایک پختہ کار اور صحیح الفکر مدبر کی حیثیت سے اقبال نے تجویز کیا کہ ایک پرآشوب دور میں پہلے سے طے شدہ ضوابط کی تقلید ہی مناسب ومفید ہے:

مضمحل گردد چو تقویمِ حیات ملت از تقلید می گیرد ثبات

راہِ آبا رو کہ ایں جمعیت است معنیٔ تقلید ضبطِ ملت است

ایسی با اُصول تقلید وحدتِ ملی اور جماعت کے نظم وضبط کے تحفظ کا باعث ہوتی ہے، اس لیے کہ اس کی بنا تصورِ توحید پر استوار ہوتی ہے:

نقش بر دل معنیٔ توحید کن چارہ کارِ خود از تقلید کن

اسلاف کی تقلید خیر وبرکت کی ضامن ہے، اس لیے کہ اُنھوں نے بڑی احتیاط، نہایت غور وفکر اور کامل بے غرضی دبے لوثی کے ساتھ قرآن وسنت کی روشنی میں معاشرت کے احکام مرتب کیے، اُنھوں نے منشا شریعت کو صحیح طور پر سمجھا اور جو کچھ تجویز کیا تقویٰ کے ساتھ:

ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر
عقلِ آبایت ہوس فرسودہ نیست کارِ پاکاں از غرض آلودہ نیست
فکرِ شاں ریسد ہمی باریک تر ورعِ شاں با مصطفیٰ نزدیک تر

زوال وانحطاط کے دور میں اجتہاد انتشار انگیز ہوتا ہے:

اجتہاد اندر زمانِ انحطاط قوم را برہم ہمی پیچد بساط

تقلید بہر حال آئینِ قرآنی کی ہے جو اللہ کی رسی ہے اور اسے مضبوطی سے تھام لینے کے لیے فرمانِ خداوندی واعتصموا بحبل اللہ نازل ہوا۔ ایک آئین کی پیروی سے اتحاد واتفاق پیدا ہوتا ہے، موتیوں کی چمکتی ہوئی بیش قیمت مالا بنتی ہے، اور نہ انسان غبارِ راہ کی طرح بکھر جاتا ہے:

از یک آئینی مسلمان زندہ است پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است
ماہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست
چوں گہر در رشتہ او سفتہ شو
ورنہ مانند غبار آشفتہ شو

سیرتِ ملی اور اتباعِ آئین

سیرتِ ملی یا اجتماعی خودی کی پختگی آئین الٰہی کے اتباع سے ہوتی ہے، اس لیے کہ علم حق شریعت کے سوا کچھ نہیں اور سنتِ رسولؐ کی پیروی محبتِ رسولؐ کے سبب ہوتی ہے، جو ہر فردِ ملت کے قلب و روح میں جاگزیں ہے۔ نظامِ ملت آئینِ حق پر عمل سے قائم ہوتا ہے اور اس نظام کی محکمی ملت کے لیے بقائے دوام کا باعث ہے۔ اسلام کی حقیقت ہی شرعِ رسولؐ ہے، شریعتِ محمدیؐ سے دین کا آغاز بھی ہوتا ہے اور اسی پر دین کا انجام بھی منحصر ہے:

علم حق غیر از شریعت ہیچ نیست اصل سنت جز محبت ہیچ نیست
ملت از آئین حق گیرد نظام از نظام محکمے خیزد دوام
باتو گویم سرِ اسلام است شرع شرع آغاز است و انجام است شرع

دینِ مصطفیٰؐ دینِ حیات ہے اور شریعت محمدی آئینِ حیات کی تفسیر ہے، جو کچھ کتاب اللہ میں درج ہے سنت اللہ اس کی ہی تشریح وتعمیل کرتی ہے۔ اپنے اقوال وافعال کے ذریعے رسولِ خدا نے جو کچھ ہدایت دی ہیں وہ سب احکام الٰہی کے مطابق ہیں۔ اس طرح شریعت دراصل قانون قدرت پر عمل کا پیغام اور طریقہ ہے۔ جو جماعت اُس طریقے پر کار بند ہوگی وہ فولاد کی طرح مضبوط ہو جائے گی۔ ایک سیسہ پلائی ہوئی

دیوار (بنیان مرصوص) بن جائے گی، جس میں کوئی شگاف نہیں ہوگا، وہ دنیا میں ایک کوہ وقار کے مانند کھڑی ہوگی:

از عمل آہن عصمت می سازدت — جائے خوبے در جہاں اندازدت
خستہ باشی استوارت می کند — پختہ مثل کوہسارت می کند
ہست دینِ مصطفیٰ دینِ حیات — شرعِ او تفسیرِ آئینِ حیات

ملتِ اسلامیہ کے کردار کی استواری عربی صلابت سے وابستہ ہے، نہ کہ عجمی لطافت سے۔ اصلاً یہ عرب کا سوز دروں اور جذبۂ عمل ہے، نہ کہ عجم کی فلسفہ طرازی وتن آسانی، جو ملتِ اسلامیہ کی طاقت، جمعیت اور شوکت کا باعث ہے:

قلب رازیں حرف حق گرداں قوی — باعرب در ساز تا مسلم شوی

اجتماعی کردار اور اسوۂ رسولؐ

اسلامی شریعت کا مثالی نمونہ سیرتِ رسولؐ ہے، جسے قرآن نے اسوۂ حسنہ اور خلق عظیم قرار دیا ہے۔ لہٰذا افرادِ ملت کی حیثیت سے مسلمانوں کا اجتماعی کردار اسوۂ رسولؐ پر مبنی ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰؐ کے عادات و اطوار ہی ایک اچھے انسان اور سچے مسلمان کے لیے نمونے کے اخلاق ہیں۔ یہ آپ ہی کے اخلاق کا نتیجہ ہے کہ مسلمان کی فطرت وخصلت دنیا کے انسانوں کے لیے سراپا رحمت وشفقت ہے۔ ہر فرد ملت ایک قطرۂ نیساں کی طرح ہے جو سیرتِ رسول کے بحرِ بے کراں کی تہہ میں بیٹھ کر موتی بن جاتا ہے۔ جو شخص آفتاب رسالت سے روشنی حاصل کرتا ہے اس کے کردار کی تابانی کبھی ماند نہیں پڑتی، حسنِ عمل اسے زندۂ جاوید بنا دیتا ہے:

فطرت مسلم سراپا شفقت است — در جہاں دست و زبانش رحمت است
آں کہ مہتاب از سر انگشتش دونیم — رحمت او عام و اخلاقش عظیم
طینت پاک مسلماں گوہر است — آب و تابش ازیم پیغمبر است
آب نیسانی بہ آغوشش در آ — وزمیان قلزمش گوہر برآ
در جہاں روشن تر از خورشید شو
صاحبِ تابانیِ جاوید شو

ملت کا مرکز محسوس

مظاہرِ فطرت اور حقائقِ کائنات کے مشاہدے اور مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شے کا وجود ارتکاز

سے وابستہ ہے، آگ کی اڑتی ہوئی چنگاریاں مرتکز ہوکر لالہ بن جاتی ہیں، ہوا کی بہتی ہوئی لہریں سینے کے اندر مرتکز ہوکر سانس بن جاتی ہیں، بکھرے ہوئے نباتی عناصر مجتمع ہوتے ہیں تو ایک دانے سے ایک درخت اُگ جاتا ہے۔ انسان کی نگاہیں اسی طرح ایک نقطے پر مرکوز ہوکر زندگی کے سارے کمالات دکھاتی ہیں۔ یہ فطرت کا تقاضا ہے کہ ملت کا ایک محسوس مرکز ہو، جو اس کی جمعیت کا سامان کرے۔ ملت کا سارا ربط و نظام مرکزیت سے وابستہ ہے:

ہم چناں آئین میلادِ امم زندگی بر مرکزے آید بہم
حلقہ را مرکز چوجاں در پیکر است خط او در نقطۂ او مضمر است
قوم را ربط و نظام از مرکزے روزگارش را دوام از مرکزے

زندگی ایک مرکز پر آتی ہے تو ملت پیدا ہوتی ہے، کسی حلقے کے لیے مرکز کی حیثیت جسم میں جان کی ہے، جیسے کوئی بھی لکیر ایک نقطے سے شروع ہوتی ہے، قوم کی ہم آہنگی اور تنظیم اس کے مرکز پر منحصر ہوتی ہے اور اسی مرکزیت سے اسے استقلال و استحکام نصیب ہوتا ہے۔

ملتِ اسلامیہ کا مرکز محسوس خانہ کعبہ ہے، جو امتِ مسلمہ کے تمام سوز و ساز کا سرچشمہ ہے، حرم کے ساتھ تعلق کے سبب ہی ہم زندہ ہیں اور جب تک اس کا طواف کرتے رہیں گے پایندہ ہوں گے، ہماری اجتماعیت حرمِ کعبہ پر مبنی ہے:

راز دار و رازِ ما بیت الحرم سوزِ ما ہم سازِ ما بیت الحرم
تو ز پیوندِ حریمے زندۂ تا طواف او کنی پائندہ
در جہاں جان امم جمعیت است در نگر سر حرم جمعیت است

لا مرکزیت کی تباہیوں کے لیے سب سے عبرت ناک مثال یہودیوں کی ہے، جو پوری دنیا میں بکھرے ہوئے اور دوسری قوموں کے رحم و کرم پر ہیں، ان کا اپنا کوئی مستقل بالذات مرکز ایسا نہیں جو ان کے بل بوتے پر قائم ہو۔ چنانچہ ان کی فطرت و سیرت مسخ ہوچکی ہے اور وہ انسانی تاریخ کی سب سے مردود قوم بن گئے ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کو اپنے حرم کی قدر و منزل اور اہمیت و عظمت سے آشنا ہونا چاہیے۔ کعبے میں سجدہ ریز ہوکر اور اس کے نیاز مند بن کر ملت کے اسلاف نے ایک عالم میں ہنگامہ بپا کر دیا تھا اور پوری دنیا ان کی ناز برداری کرنے لگی تھی۔ لہٰذا آج کے مسلمانون کو اپنے جلیل القدر اسلاف کے رستے پر چل کر ان ہی کے جیسا اعزاز و اکرام حاصل کرنا چاہیے:

مثلِ آبا غرق اندر سجدہ شو آں چناں گم شو کہ یکسر سجدہ شو
مسلمِ پیشیں نیازے آفرید تابہ نازِ عالم آشوبے رسید

ملت کا نصب العین: توحید

مدعا و مقصد مایہ وجود ہے، ہستی کا سارا کارخانہ کسی نشانے تک پہنچنے کے لیے چل رہا ہے، بغیر منزلِ مقصود کے سفرِ حیات ممکن نہیں، نصب العین اور مطمحِ نظر ہی سے انسان میں حرکتِ عمل پیدا ہوتی ہے، اس کی ساری سرگرمیاں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ہیں، مدعا کا تقاضا آدمی کے اندر ہمت بھی پیدا کرتا ہے اور قوت بھی، تمام عزائم اور آرزو میں مقصود کی کشش سے ابھرتی ہیں، دنیا ایک صحرا ہے اور انسان ایک محمل کے تعاقب میں دوڑ رہا ہے، جو اس کی نگاہوں کے اُفق پر ہمیشہ موجود ہے اور اگر وہ اس سے ایک لمحہ بھی غافل ہو جائے تو یہ محمل نظروں سے پوشیدہ ہو جائے گا۔ پھر منزل کی طرف جانے والے راستے کے فاصلے ناقابلِ عبور ہو جائیں گے۔ کائنات کا ایک منتہا ہے جس تک وہ صدیوں کے بعد اور لاتعداد مراحل طے کر کے پہنچی ہے، کتنے ہی نقوش لوحِ زندگی پر ثبت ہوئے، کتنے ہی باطل خداوندوں سے سابقہ پڑا، تب دنیا میں اذاں کی آوازنوائے حق بن کر گونجی، ایمان کا غلغلہ بلند ہوا، توحید کا کلمہ انسان کی زبان پر جاری ہوا، لا الہ الا اللہ نقطہ پرکارِ حق اور منتہائے کائنات ہے۔ یہی وہ آفاقی صداقت ہے جس کی برکت سے آسمان کے طبقات قائم ہیں، آفتاب روشن ہے، دریا میں موج تڑپ رہی ہے اور سمندر کی تہہ میں موتی بن رہے ہیں، مٹی پھول کھلا رہی ہے، بلبل زمزمہ سنج ہے، انگور کے خوشے چمک رہے ہیں۔

ملتِ اسلامیہ کا نصب العین یہی توحید ہے، جس کے نشر و اشاعت کے منصب پر وہ مامور کی گئی ہے، کائنات میں تکبیر کا بول بالا کرنا ہی ملت کا مقصدِ وجود ہے۔ انسان تاریخ میں طرح طرح کی بت سازیاں کرتا رہا ہے، عصر حاضر نے بھی رنگ و نسل اور ملک و نسب کے اصنام تراش لیے ہیں، جن کی پرستش آج کی متمدن دنیا میں ہر جگہ ہو رہی ہے اور ان جھوٹے خداؤں کی قربان گاہ پر انسانیت کی بھینٹ چڑھائی جا رہی ہے۔ ہر طرف کشت و خون کا بازار گرم ہے۔ نمرود و آزر کے اس دورِ تباہی میں مسلمان کو ابراہیم خلیل اللہؑ کی طرح کامل و خالص توحید کا علم اٹھا کر سارے باطل خداؤں کے سر کچل دینے چاہییں اور بنی نوعِ انسان کو ان کے چنگل سے چھٹکارا دلا کر امنِ عامہ سے ہم کنار کرنا چاہیے، تاکہ تخریب کے بجائے تعمیر کا دور دورہ ہو اور کاروانِ حیات ارتقا کی اگلی منزلوں کی طرف قدم بڑھا سکے:

چوں حیات از مقصدے محرم شود — ضابطِ اسباب ایں عالم شود
ہمچو جاں مقصود پنہاں در عمل — کیف و کم ازوے پذیرد ہر عمل
مدعا مضرابِ سازِ ہمت است — مرکزے کو جاذب ہر قوت است
تخمِ ایماں آخر اندر گل نشاند — بازبانت کلمہ توحید خواند

نقطہ ادوار عالم لا الٰہ انتہائے کار عالم لا الٰہ
زانکہ در تکبیر رازِ بودِ تست حفظ و نشر لا الٰہ مقصود تست
فکرِ انساں بت پرستے بت گرے ہر زماں در جستجوے پیکرے
باز طرح آزری انداخت است تازہ تر پروردگارے ساخت است
اے کہ خوردستی زمینائے خلیل گرمیِ خونت زصہبائے خلیل
برسرِ ایں باطلِ حق پیر ہن تیغ لا موجود الا ھو بزن

ہر دور کی طرح عصر حاضر میں بھی صرف ملت اسلامیہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ایک بار پھر توحید کا نعرہ بلند کرے گی، اس لیے کہ وہ خدا کے آخری پیغام کی حامل ہے اور دین اسلام کی تکمیل اس شریعت محمدی پر ہی ہوئی ہے جس کی حامل تاریخ میں ملت اسلامیہ رہی ہے، لہٰذا وہی آج کی جاہلیت جدیدہ میں حق کا نور پھیلا کر بڑھتی ہوئی تاریکی کو دور اور زمانے کو روشن کر سکتی ہے:

جلوہ در تاریکیِ ایام کن
آں چہ بر تو کامل آمد عام کن

تسخیرِ کائنات

توحید ایمان بالغیب ہے۔ ایک حاضر و ناظر خدا پر یقین انسان کو کائنات کی تمام غیبی قوتوں پر دست رس کے لیے ابھارتا ہے، جب کہ موجودات کی تسخیر اس کا مقصدِ وجود ہے، جو خدا کا ہو جاتا ہے پوری خدائی اس کی ہو جاتی ہے، خدا کو ماننے والا آدمی ہر قسم کی قیود و حدود سے آگے نکل جاتا ہے، اس کا مطلب ایک لامکاں، ہستی، ازل ہے، جس کی تلاش میں اسے ابد تک سرگرداں رہنا چاہیے۔ لہٰذا تمام محسوسات پر قابو حاصل کرنا انسانیت کا نصب العین ہے، ساتھ ہی کائنات کے سارے اسرار و رموز کا تجسس اس کی فطرت میں داخل ہے:

اے کہ بانایدہ پیماں بستہ ہمچو سیل از قیدِ ساحل رستہ
ہستیِ حاضر کند تفسیر غیب می شود دیباچہ تسخیرِ غیب
ماسوا از بہرِ تسخیر است و بس سینہِ او عرضہ تیر است و بس
ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد عالمے از ذرۂ تعمیر کرد

لہٰذا عالم اسباب سے صرف نظر کرنے کے بجائے اس کے ساتھ پورا پورا اعتنا و التفات کرنا چاہیے، دنیا مسلم کی خودی کی توسیع و ترقی کے لیے ہے، تاکہ اس کی شخصیت کے تمام امکانات بروئے عمل

آئیں، جہاں اخیار و صالحین کے لیے ہے، اس کا مشاہدہ و مطالعہ کرنا ہے، نفس کی معرفت کے ساتھ ساتھ آفاق کا عرفان مومن کو معیارِ وجود پر پورا اترنے کے قابل بنانا ہے، واقعہ یہ ہے کہ اگر ہم عالم کی تسخیر نہ کریں گے تو عالم ہمیں مسخر کر لے گا:

اے کہ از تاثیر افیوں خفتۂ ‏ ‏ عالم اسباب را دوں گفتۂ
غایتش توسیع ذاتِ مسلم است ‏ ‏ امتحانِ ممکناتِ مسلم است
حق جہاں را قسمتِ نیکاں شمرد ‏ ‏ جلوہ اش با دیدۂ مومن سپرد
کارواں را رہ گزار است ایں جہاں ‏ ‏ نقدِ مومن راعیار است ایں جہاں
گیراو را تانہ او گیرد ترا
ہمچو نے اندر سبو گیرد ترا

نظامِ کائنات پر قابو حاصل کر کے ہی انسان تکمیلِ ذات کر سکتا ہے، وہ نائبِ حق ہے، لہٰذا عناصر پر اس کا حکم چلنا چاہیے۔ مومن کو پانی سے بجلی اور دھوپ سے روشنی پیدا کرنی ہے، اسے پوری تدبیر کے ساتھ اشیا کی حقیقت کا سراغ لگانا اور اس سے مصرف لینا ہے۔ اس طرح فطرت کی قوتوں کا استعمال کر کے انسان برق و حرارت پر سوار ہو چکا ہے اور مزید انکشافات و ایجادات کے بعد اپنے خلائی سفر میں مادی کائنات کی آخری حد تک جا سکتا ہے، جب کہ اس کی روحانی طاقت بھی انتہائی حد تک بڑھ چکی ہوگی۔ آدمِ خاکی کا سارا اعتبار ''علم آدم الاسماء کلھا'' کی تعلیم پر عمل سے ہی قائم ہے، ایک ناپیدا کنار کائنات میں حکمتِ اشیا کا علم و تجربہ ہی انسان کے تحفظ کا سب سے بڑا قلعہ اور اس کی ترقی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے:

تاز تسخیر قوائے ایں نظام ‏ ‏ ذو فنونیہائے تو گردد تمام
نائب حق درجہاں آدم شود ‏ ‏ بر عناصر حکمِ او محکم شود
تابش از خورشید عالم تاب گیر ‏ ‏ برقِ طاق افروز از سیلاب گیر
جستجو را محکم از تدبیر کن ‏ ‏ انفس و آفاق را تسخیر کن
چشم خود بکشا و در اشیا نگر ‏ ‏ نشہ زیرِ پردہ صہبا نگر
آں کہ بر شیا کمندانداخت است ‏ ‏ مرکب از برق و حرارت ساخت است
علم اسما اعتبار آدم است
حکمت اشیا حصارِ آدم است

ملی خودی کا انفرادی احساس اور پاسِ روایات

جس طرح ایک بچہ بالغ ہوکر گرد و پیش کا فہم حاصل کرتا اور اپنے ماحول کی حقیقت سمجھتا ہے اسی طرح اجتماعی زندگی کا کمال یہ ہے کہ جماعت اسی شدت کے ساتھ اپنی خودی کو محسوس کرلے جس شدت کے ساتھ ایک فرد اپنی ذات کا احساس کرتا ہے۔ یہ ملی احساس اسی وقت ممکن ہے جب اجتماعی روایت کا پورا پورا تحفظ کیا جائے، اپنی تاریخ ہمیشہ ذہن میں تازہ رکھی جائے، ملی سرگزشت فراموش نہ کی جائے۔ تاریخ کوئی داستان نہیں، یہ واقعات کی ایک زنجیر ہے، سلسلہ روز و شب پر نظر رکھ کر ہی دنیا میں کچھ کیا جاسکتا ہے، قومی کمالات کو یاد رکھنے سے ملی شعور بیدار رہتا ہے اور ہر فرد ملت کو عمل پر اُبھارتا ہے، جس سے گردشِ ایام کے درمیان پائداری حاصل ہوتی ہے:

صد گرہ از رشتہ خود وا کند — تا سرِ تارِ خودی پیدا کند
گرم چوں افتد بہ کارِ روزگار — ایں شعورِ تازہ گردد پائدار
قوم روشن از سوادِ سرگزشت — خود شناس آمد زیادِ سرگزشت
ربطِ ایام است مارا پیرہن — سوزنش حفظِ روایاتِ کہن

زندگی ایک تسلسل کا نام ہے۔ لہٰذا اجتماعی وجود اسی وقت باقی رہ سکتا ہے جب ملی تاریخی محفوظ ہو۔ حیات ایک وحدت ہے۔ لہٰذا ماضی و حال و مستقبل کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ رہنا چاہیے:

ضبط کن تاریخ را، پاینده شو — از نفس ہائے رمیده زنده شو
سرزند از ماضیِ تو حالِ تو — خیزد از حال تو استقبال تو

زمانے میں لازوال ہونے کا نسخہ یہی ہے کہ فرد جماعت کی موجودہ، گزشتہ اور آئندہ تاریخ کے ساتھ مربوط رہے۔ تسلسل کا یہ ادراک زندگی کی سب سے بڑی علامت اور کسی وجود کی بے خطا شناخت ہے:

مشکن اَر خواہی حیاتِ لازوال — رشتۂ ماضی ز استقبال و حال
موجِ ادراکِ تسلسل زندگی است — مے کشاں را شورِ قلقل زندگی است

یعنی ملت کے تاریخی واقعات کا مربوط احساس دراصل دنیا میں زندگی کے تسلسل کا ادراک ہے، ہر لمحے کے ساتھ دوسرا لمحہ پیوستہ ہے، حال کے ایک سرے پر ماضی ہے تو دوسرے سرے پر مستقبل، ان دونوں کی جامعیت ہی حال کو بامعنی اور نتیجہ خیز بناتی ہے، صراحی سے قطرہ قطرہ شراب ٹپکتی ہے اور اس ترشح سے قلقل کی آواز بلند ہوتی ہے، جسے سن کر ہی مے کشوں کو زندگی کا احساس ہونے لگتا ہے اور ان کی روح سرشار ہوجاتی ہے۔ اسی طرح ملی روایات کا مطالعہ افراد کے عزائم بلند کرتا اور انھیں جینے اور کچھ کر گزرنے کا حوصلہ

عطا کرتا ہے، وہ اپنے اسلاف کے کارناموں سے اپنے کردار کے لیے ایک نمونہ حاصل کرتے ہیں، ان کے اندر جوشِ عمل پیدا ہوتا ہے اور وہ بڑی امنگ کے ساتھ اپنے کمالات دکھاتے ہیں۔

امت اور امومت

اُمت اور امومت دونوں الفاظ کی اصل ایک ہے، اُم۔ اس طرح ملتِ اسلامیہ کی خودی کے لیے ماں کی حیثیت سے عورت کا رتبہ بہت بلند اور اہم ہے۔ اسی لیے تاریخِ انسانی میں اسلام نے عورت کو جو مقام دیا ہے وہ نہ تو جدید آزادی نسواں دے سکی نہ قدیم غلامی نسواں، کہیں افراط ہے تو کہیں تفریط، توازن صرف اسلام میں ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے قرآن کے لفظوں میں عورت مرد کا لباس ہے، جس طرح مرد عورت کا لباس ہے، یعنی دونوں ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں، ایک کا وجود دوسرے کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ لہٰذا شریعت محمدی نے سماج اور خاندان پر عورت کے حقوق نہایت اعتدال و انصاف کے ساتھ معین کر دیے ہیں۔ اسلامی سماج میں عورت کی ایک مستقل ہستی اور خودی ہے، جس کی ترقی کے لیے وہ اپنے مخصوص دائرۂ عمل کی حدود میں کام کرتی ہے۔ مرد ہی کی طرح عورت ایک خاندان کی فرد ہے اور اس کا وجود چند رشتوں سے محکم ہوتا ہے، وہ محض عورت اور علامتِ جنس نہیں ہے جس سے مرد آزادی اور برابر کے نام پر کھیلتے اور اس کی آبرو لوٹ کر اسے اپنی خواہشات نیز مفادات کے لیے استعمال کرتے رہیں، جیسا جدید مغربی تمدن و تہذیب میں ہو رہا ہے، بلکہ عورت کسی کی بیٹی ہے، کسی کی بہن، کسی کی بیوی اور سب سے بڑھ کر کسی کی ماں، جس طرح مرد باپ، بھائی، شوہر اور بیٹا ہے۔ رشتے کا یہی وہ تقدس ہے جس کے پیش نظر ایک حدیث میں بتایا گیا ہے کہ جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اولاد ماں کے آغوشِ تربیت میں پرورش پاتی ہے اور بچوں کے کردار پر بہت ہی فیصلہ کن اثر ماں کے اخلاق کا پڑتا ہے۔ اس طرح آئندہ نسلوں اور انسانیت کے مستقبل کا مدار ماں کی حیثیت سے عورت کی سیرت پر ہے۔ عصر حاضر کی غیر متوازن تمدنی ترقیات میں انسانی سماج کی یہ بنیادی حقیقت فراموش کر دی گئی ہے، مغربی سماج نے زن کو نازن بنا دیا ہے، یورپ اور امریکہ کا معاشرہ مرگِ امومت سے دوچار ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں جتنی جتنی صنعتی ترقیات ہو رہی ہیں معاشرتی الجھنیں اتنی ہی بڑھتی جا رہی ہیں، خاندان کا شیرازہ بکھر چکا ہے اور انسان کی حیثیت سے نئی نسلوں کا مستقبل ایک سوالیہ نشان بن گیا ہے۔ انفرادی و اجتماعی دونوں قسم کی خودی کے تحفظ کے لیے وقت کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے۔ لہٰذا اشد ضرورت ہے کہ بقائے نوع کے لیے اسلامی تصورِ امومت کی اہمیت کو سمجھا جائے اور اسلام نے خواتین کے تحفظ و احترام کے لیے جو ضابطہ حیات تجویز کیا ہے اس پر پورا پورا عمل کیا جائے۔ اس ضابطے کا مقصد یہ ہے کہ عورتوں کی عفت و حیا کے لیے سازگار ماحول پیدا

کیا جائے، جس میں بے پردگی، عریانی فحاشی، آزادانہ اختلاطِ مرد وزن اور ہوس رانی نہ ہو:

اسلام

پوششِ عریانیِ مرداں زن است — حسنِ دل جوعشق را پیرہن است
از امومت پختہ تر تعمیرِ ما — در خطِ سیمائے او تقدیرِ ما
ہست اگر فرہنگ تو معنی رسے — حرفِ امت نکتہ ہا دارد بسے
ملت از تکریم ارحام است و بس — ورنہ کارِ زندگی خام است و بس
از امومت گرم رفتارِ حیات — از امومت کشفِ اسرارِ حیات

مغرب

شوخ چشم و فتنہ زا آزادیش — از حیا ناآشنا آزادیش
علم او بارِ امومت بر نتافت — برسرِ شامش یکے اختر نتافت

ایک عورت کا مثالی نمونہ حضرت فاطمہ زہراؓ بنتِ رسول کی شخصیت ہے، جو ختم الرسلؐ کی دختر ہونے کے ساتھ ساتھ شیر خدا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زوجہ مکرمہ اور حضرت امام حسینؓ کی والدہ محترمہ ہیں۔ ان کی زندگی کی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے اخلاق سے گھر کا ایک ایسا ماحول بنایا جس میں شہید کربلا جیسے مرد حق کی پرورش ہوئی۔ اس ماحول میں خدا کی بندگی، احکام رسول کی اطاعت، شریعت کی پابندی شوہر کے ساتھ وفاداری، اولاد کی تربیت اور ضرورت مندوں کی خدمت کے عناصر نمایاں تھے، صبر وشکر کے ساتھ دنیا کے ہر کام اور وقت کے ہر لمحے میں رضائے الٰہی کے حصول کی کوشش ہوتی تھی، اپنے معاملات میں قناعت و احتیاط اور دوسروں کے ساتھ ہم دردی وغم خواری کی جاتی تھی، پورا خاندان وقار وایثار کا ایک نمونہ تھا:

آں یکے شمعِ شبستان حرم — حافظِ جمعتی خیر الأمم
مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؓ — مادراں را اسوۂ کامل بتولؓ
بہر محتاجے دلش آں گو نہ سوخت — با یہودے چادرے خود را فروخت
آں ادب پروردۂ صبر و رضا — آسیا گرداں و لب قرآں سرا

خلاصۂ مباحث

مثنوی اسرار ورموزِ خودی وبیخودی کے تمام مباحث ومضمرات کا خلاصہ سورۂ اخلاص ہے، جس کی ہر آیت خودی کے کسی نکتے پر مشتمل ہے۔ اس طرح خودی کا جو فلسفہ اقبال نے مثنوی میں پیش کیا ہے وہ ان کے بقول قرآن بالخصوص اس کی ایک مختصر ترین سورہ سے ماخوذ ہے۔ چنانچہ شاعر نے مذکورہ سورہ کی آیات

کی تفسیر اپنے اشعار سے کی ہے۔

قل ھو اللّٰہ احد (کہو اللہ ایک ہے)

خودی کا اصل الاصول توحید ہے، معرفتِ نفس معرفتِ رب کے بغیر ممکن نہیں، یہ ایک خدا کے اقرار ہی کا فیض ہے کہ انسان کو صحیح معنے میں عرفانِ ذات حاصل ہوتا ہے اور وہ اپنی حدود اور امکانات دونوں سے بیک وقت آگاہ ہو جاتا ہے، جس کے سبب اس کے شعورِ ذات میں اعتدال اور اس کے مطابق عمل میں توازن پیدا ہوتا و ہے۔ زندگی میں حقیقت پسندی حق شناسی پر ہی مبنی ہے۔ وحدتِ الٰہ کا تصور طبیعت میں یک سوئی سیرت میں ہمواری اور کردار میں استواری پیدا کرتا ہے۔ توحید فرد اور سماج کے اندر مرکزیت قائم کرتی ہے۔ مسلم کا مطلب ہی ہے کہ ایک خدا کی بندگی یہ بندگی ایسی بلندی کا باعث ہے کہ پوری کائنات انسان کے لیے مسخر ہو جاتی ہے اور اس کی شخصیت اشرف المخلوقات بن جاتی ہے۔ اسی لیے صبغۃ اللہ کی آیت کے علاوہ حدیث رسول ہے کہ تخلقوا باخلاق اللّٰہ یعنی اپنے اندر صفات الٰہیہ یا اسمائے حسنیٰ کی خصوصیات پیدا کرو۔ ملی اتحاد و اتفاق بھی توحید ہی پر عمل کا عطیہ ہے۔ ایمان کا اعتبار عمل سے ہے، ایک فرد ایک سماج کے اندر عمل کر کے وجود کی آفاقیت کی شہادت دیتا ہے:

ایں کہ در صد سینہ پیچد یک نفس
سرے از اسرارِ توحید است و بس
رنگ او برکن مثال او شوی
در جہاں عکس جمال او شوی
آں کہ نام تو مسلماں کردہ است
از دوئی سوے یکی آوردہ است
با یکی ساز، از دوئی بردار رخت
وحدتِ خود را مگر داں لخت لخت
یک شود توحید را مشہود کن
غائبش را از عمل موجود کن
لذتِ ایماں فرزاید در عمل
مردہ آں ایماں کہ ناید در عمل

اللّٰہ الصمد (اللہ بے نیاز ہے)

خدا کی بے نیازی اس پر ایمان رکھنے والے کو بھی بے نیاز بنا دیتی ہے، مومن مسوا اور غیر اللہ کی غلامی و تابعداری سے آزاد ہو جاتا ہے، خدا کے سوا اس کا سر کسی کے آگے نہیں جھکتا، اس کی سرفرازی کے سامنے کائنات کی ہر قوت پست ہو جاتی ہے، ایک عاف باللہ مرد فقیر جیسے امام مالک، ایک زبردست بادشاہ، جیسے ہارون رشید کے دربار میں حاضر ہونے کے بجائے اسے اپنے دربار میں لاتا ہے، جو دیارِ رسول میں واقع ہے، خوددار اور بے غرض انسان دنیا کی کسی طاقت کا نیاز مند نہیں ہوتا، اس کا صرف ایک رنگ ہوتا ہے، اللہ کا رنگ، جس کے ساتھ دوسرے کسی کا رنگ اس کو گوارا نہیں جو انسان اپنی اس حقیقت کو بھول جاتا ہے وہ نسخہ کیمیا کو چھوڑ کر خاک بہ سر ہو جاتا ہے اور اپنی رسوائی کا سامان کرتا ہے۔ آدمی کو پروانے کی طرح دوسرے کی روشنی کیگرد طواف نہیں کرنا چاہیے، شمع کی طرح اپنے نور باطن سے جو نور خداوندی ہے روشن ہونا اور پوری دنیا کو روشن کرنا چاہیے۔ وہی فرد صحیح معنے میں فرد ہے جو اپنی شناخت رکھتا ہے اور وہی قوم صحیح معنے میں قوم ہے جو صرف اپنی ملی خصوصیات پر اعتماد کرتی ہے۔ مسلمان کے لیے ایک خدا کی بندگی کافی ہے:

بندۂ حق بندۂ اسباب نیست
زندگانی گردش دولاب نیست
مسلم استی بے نیاز غیر شو
اہل عالم را سرا پاخیر شو
بے نیازی ناز ہا دارد بسے
ناز او انداز ہا دارد بسے
بے نیازی رنگ حق پوشیدن است
رنگِ غیر از پیرہن شوئیدن است
بر دلِ خو نقشِ غیر اند اختی
خاک بردی کیمیا در باختی
تا کجا طوفِ چراغ محفلے
ز آتشِ خود سوز اگر داری دلے
فرد فرد آمد کہ خود را وا شناخت
قوم قوم آمد کہ جز باخود نہ ساخت

از پیام مصطفیٰ آگاہ شو
فارغ از ارباب دون اللہ شو

لم یلد و لم یولد (خدا نہ کسی کا باپ ہے نہ بیٹا)

اسلامی تصور کے مطابق خدا کا تو الدوتناسل سے بالا ہونا عام انسانی اخوت و مساوات کی ضمانت ہے۔کسی خاص انسان کے ساتھ خدا کا کوئی ذاتی رشتہ ناطہ نہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک حدیث رسول کے مطابق تمام مخلوقات اللہ کا کنبہ (الخلق عیال اللہ) ہیں اور ان کے درمیان حسب نسب، منصب، رنگ وغیرہ کا کوئی امتیاز نہیں۔لہٰذا اگر ملت اسلامیہ کے اندر رنگ وخوں کا کوئی امتیاز کیا جانا ہے تو اس سے ملی اخوت پر ضرب پڑتی ہے:

قوم تو از رنگ و خوں بالاتر است
قیمت یک اسودش صد احمر است
گر نسب را جزو ملت کردۂ
رخنہ درکار اخوت کردۂ

توحید کی علم بردار امم مسلمہ کے اندر اس تفرقے کی کوئی گنجائش اصولاً نہیں پائی جاتی۔تمام افرادِ ملت عالمی سطح پر ایک خدا کے ساتھ ایک ہی رسولؐ کے ماننے والے اور ان سے محبت رکھنے والے ہیں، رسول خداؐ کی یہ الفت ان کی ہم آہنگی کے لیے کافی ہے،قوم رسول ہاشمیؐ ایک خاص ترکیب کی حامل ہے، جو دوسری ملتوں کے برخلاف ملک ونسب کی حد بندیوں سے پرے ہے،ایمان اللہ کے ساتھ ساتھ صرف عشق رسولؐ اہلِ اسلام کی جمعیت کا سرمایہ ہے یہی مسلمانوں کا دین وایمان ہے،خدا و رسول کے احکام و ہدایات پر بے چون و چرا عمل کرنا ہی ان کی شان ہے:

نیست از روم و عرب پیوندِ ما
نیست پابند نسب پیوند ما
دل بہ محبوب حجازی بستہ ایم
زیں جہت با یک و گر پیوستہ ایم
رشتۂ ایک تو لایش بس است
چشم ما را کیف صہبایش بس است

عشق او سرمایۂ جمعیت است
ہمچو خوں اندر عروقِ ملت است

و لم یکن له کفو احد (کوئی خدا کا ہمسر نہیں)

خدا کی ذات وحدہ لاشریک ہے۔ چنانچہ اس کے بندوں کا بھی کوئی حریف و ہمسر نہیں۔ ایک آیتِ قرآنی کے مطابق اہل ایمان اپنے کردار کی بنا پر دوسروں سے بلند تر ہیں: و انتم الا علون ان کنتم مومنین۔ مسلمان صحیح معنے میں بندۂ مولا صفات ہے:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز

(مسجد قرطبہ-بالِ جبریل)

اسی حیثیت سے مسلمان دوسرے انسانوں کے ساتھ عفو و عدل اور احسان و فیاضی سے کام لیتا ہے، یہاں تک کہ اس کا قہر بھی اللہ کی مخلوقات کے لیے ایک کرم ہے، اس لیے کہ وہ ظلم و ستم کے سامنے سینہ سپر ہو جاتا اور باطل کا پنجہ مڑوڑ کر بنی نوع انسان کے لیے امن و امان اور سکون و راحت کا سامان کرتا ہے، اس کی دوستی بھی اللہ کے لیے ہے اور دشمنی بھی اللہ کے لیے:

آں کہ ذاتش واحد است و لاشریک
بندہ اش ہم ورنہ سازد باشریک
مومن بالاے ہر بالاترے
غیرتِ او بر نتابد ہمسرے
خرقۂ لا تحزنوا اندر برش
انتم الاعلون تاجے برسرش
عفو و عدل و بذل و احساس عظیم
ہم بہ قہر اندر مزاج او کریم

اس طرح مومن کی اجتماعی نیز انفرادی خودی اس کی اپنی شخصیت کی بالیدگی کے ساتھ سات پورے انسانی معاشرے کی ترقی کا باعث ہے، اس کی خودی و بے خودی دونوں سے صلاح و فلاح کا سامان ہوتا ہے۔ لیکن عصر حاضر میں مسلمانوں کی یہ خودی گم ہو چکی ہے اور وہ دنیا میں ہر جگہ قومیت اور وطن پرستی کے

اندر مبتلا ہوکر اپنے انسانی و آفاقی مشن سے غافل نظر آ رہے ہیں۔ یہ ان کی پستی اور زوال کی نشانی ہے، ورنہ معراجِ مصطفیؐ کا سبق تو یہ ہے کہ ''عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں'' مسلمان ایک ناوک ہے اور ''ہدف اس کا ہے ثریا'' لہٰذا اس کا نعرہ ہونا چاہیے ''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں''، اس لیے کہ مہر و ماہ و مشتری اس کے ہم عناں نہیں، اس کی منزل تو چرخِ نیلی فام سے پرے ہے:

تا کجا در خاک می گیری وطن
رخت بردار و سر گردوں فگن

خاتمہ کلام

اقبال کے نظریۂ خودی کا یہ ولولہ انگیز کلام ''عرض حال مصنف بحضور رحمۃ للعالمینؐ'' پر ختم ہوتا ہے۔ اس خاتمۂ کلام میں مفکر شاعر نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے۔ یہ ایک سوانحی اعتراف ہے، جس سے اس جذبے کا پتہ چلتا ہے جو اسرار و رموز خودی و بے خودی کی تصنیف کا محرک ہوا۔ اس اقرار نامے میں گرچہ خطاب بہ رسولؐ ہے، مگر گویا خدا کو حاضر و ناظر جان کر شاعر نے اپنے افکار میں پنہاں خلوص کا اظہار کیا ہے۔ اس طرح قاری کو اعتماد میں لے کر یہ بتانے کی بلیغ کوشش کی گئی ہے کہ زمزمہ سنجی سے مقصود محض شاعری نہیں ہے۔ بلکہ ایک ملت اور اس کے ذریعے پوری انسانیت کے ذہن وضمیر کو جھنجھوڑنا ہے۔ اپنے نصب العین کے سلسلے میں شاعر نے وضاحت کی ہے کہ اس کا منبع قرآن حکیم ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ عصرِ حاضر میں ملت اسلامیہ توحید سے بیگانہ اور اپنے قبلۂ نظر سے روگرداں ہو چکی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے جسم سے روح نکل چکی ہے۔ لہٰذا اس کے تن مردہ میں جان ڈالنے اور اس کے وجود میں ایک نئی روح پھونکنے کے لیے فلسفی فنکار نے مسلمانوں کو ایک بار پھر قرآن کے نظریۂ توحید اور نظام مصطفیٰ کی طرف رجوع کرنے کا پیغام دیا ہے۔ توحید کے علم بردار عاشق رسول کا نقطہ نظر یہ ہے کہ دور جدید میں امت مسلمہ کا اصل مرض ایک قسم کا شرک ہے اس لیے کہ اس نے اسلامی شریعت کے تجویز کردہ نظام حیات کو عملاً و عموماً ترک کر کے اپنے دماغ میں غیر اسلامی تصورات کا ایک بت خانہ سجا لیا ہے اور زندگی کے اجتماعی خودی مجروح ہو چکی ہے اور اس کے افراد میں شخصی خودی کا احساس بھی باقی نہیں رہا، وہ غیروں کی بندگی کر کے خود بھی رسوا ہو رہے ہیں اور ملت اسلامیہ کی ذلت کا بھی سامان کر رہے ہیں۔ وقت آ گیا ہے کہ مسلمان اپنی اس تباہ کن روش سے تائب ہو کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں اور شریعت محمدی کو اپنا دستور العمل بنا لیں تاکہ آج کی دنیا میں وہ اپنے گم شدہ قائدانہ مقام کی بازیافت کے بعد عالم انسانیت کی رہنمائی حقیقی ترقی کی بلند تر منزلوں کی طرف کر سکیں۔ اسلام کی اسی نشاۃ ثانیہ میں امت مسلمہ اور بنی نوع انسان کی نجات ہے:

مسلم از سر نبیؐ بیگانہ شد
باز ایں بیت الحرم بت خانہ شد

شیخ ما از برہمن کافر تراست
زاں کہ اور اسومنات اندر سراست
نعشش از پیش طبیبان بردہ ام
در حضور مصطفیٰ آور دہ ام
مردہ بود از آپ حیواں گفتمش
سرے از اسرارِ قرآں گفتمش
محفل از شمع نوا افروختیم
قوم را رمز حیات آموختم
عرض کن پیش خدائے عزو جل
عشق من گردد ہم آغوش عمل
دولت جان حزیں بخشندۂ
بہرۂ از علم دیں بخشندۂ
در عمل پائندہ تر گرداں مرا
آب نیسانم گہر گرداں مرا

(ڈاکٹر عبدالمغنی— اقبال کا نظریہ خودی)